اندھا قرض

لوگ میاں ایم۔این۔خان کے بارے میں کتنی بھی متضاد رائے کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ایک بات پر سب کو اتفاق تھا کہ وہ بڑے دریا دل، بڑے فیاض اور بڑے ہمدرد ہیں۔ یوں بھی وہ اپنے علاقے کے سب سے بڑے سماجی کارکن تھے۔ اخبار میں آئے دن ان کے بارے میں خبریں آتی رہتی تھیں کبھی افغان مہاجرین کے لیے چندہ دے رہے ہیں اور کبھی اپوا میں لاوارث لڑکیوں کی شادی کا خرچ اٹھا رہے ہیں۔ ملک کے سماجی حلقوں میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا پھر بھی نجی حلقوں میں لوگ اکثر ان کی بے تحاشا دولت کے متعلق قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ چرس اور افیون کی اسمگلنگ کرتے ہیں اور کچھ اس بات پر متفق تھے کہ وہ ہیروں کے سمگلر ہیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ نو دولتیے تھے بلکہ ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ منہ میں سونے کا چمچا لے کر پیدا ہوئے تھے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ ان کے والد نے کافی روپیہ اپنی عیاشیوں میں لٹا دیا تھا پھر بھی ایک ماچس فیکٹری بچ رہی تھی اور انہوں نے ہولے ہولے اپنی محنت سے چمڑا رنگنے اور چمڑے کی مصنوعات تیار کرنے کا ایک کارخانہ بھی بنالیا تھا۔

ان دنوں وہ سماجی حلقوں میں اتنے معروف نہیں ہوئے تھے اور اپنی مصنوعات بیرونی ملکوں میں روشناس کرانے کے لیے اکثر باہر کے چکر لگایا کرتے تھے۔ اسلام آباد، لاہور، کراچی، ہر بڑے شہر میں ان کی جائیداد تھی۔ خان پلازہ، خان بلڈنگ، خان کامپلیکس، خان فلیٹس، غرض روز بروز ان کی جائیداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

ابتداء میں جب انہوں نے چمڑے کا کارخانہ بنایا تھا تو ان کا خیال تھا کہ وہ اسے بہت وسعت دیں گے حتیٰ کہ ایک دن ان کا یہ کارخانہ ملک کا سب سے بڑا چمڑے کا سامان تیار کرنے والا کارخانہ ہوگا لیکن پھر جوں جوں ان کا تجربہ وسیع ہوتا گیا، ان کا فلسفہ اور خیالات بدلتے گئے اور

اپنے فالتو سرمائے کو انوسٹ کرنے کا سب سے بہتر طریقہ انہیں یہ لگا کہ وہ عمارتیں بنالیں۔ اس میں کئی فائدے تھے ایک تو ان کے قومیائے جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرا زکوٰۃ بھی واجب نہیں تھی۔ اور یہ کہ اس میں گھاٹے کا بہت کم امکان تھا ں جو فلیٹ دو سال پہلے انہوں نے اسی ہزار میں بیچا تھا وہ اب ڈیڑھ دو لاکھ میں بک رہا تھا۔

میاں ایم۔ این۔ خان نے یہ عزت و شہرت یونہی یکا یک حاصل نہیں کرلی تھی بلکہ وہ بے شمار تدریجی مراحل سے گزرے تھے۔ جب وہ صرف ایک ماچس فیکٹری کے مالک تھے تو انہیں صرف اپنے شہر کے کچھ لوگ اور ملازمین وغیرہ جانتے تھے۔ جب انہوں نے کارخانہ قائم کیا تو انہیں کچھ مزید لوگ جاننے لگے لیکن ملک گیر پیمانے پر شہرت حاصل کرنے کا خیال اخبار میں ایک سماجی کارکن کی تصویر دیکھ کر ان کے دل میں آیا تھا۔ اور اسی شام اپنے ہی شہر کے ایک رفاہی ادارے کو انہوں نے پانچ ہزار کا چیک بطور عطیہ دے دیا اور پھر ہولے ہولے ملک بھر میں ان کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔ لوگ انہیں جاننے پہچاننے لگے۔ خود صوبے کے گورنر نے کئی بار اپنے اخباری بیانات میں ان کے سماجی اور رفاہی کاموں کو سراہا تھا اور ان کے نیک جذبے کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جس طرح اچانک ایک دن ان کے دل میں سماجی کارکن بننے کا خیال آیا تھا اسی طرح ایک دن اچانک ان کے دل میں حج کرنے کا سودا سمایا تو وہ ہر سال باقاعدگی سے حج پر جانے لگے اب تک وہ گیارہ حج کر چکے تھے۔ ڈھوک مراد شاہ والے بڑے پیر جی کی بیعت بھی کرلی تھی اور ان کے قریبی مریدوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ وہ ہر جمعہ کو شہر سے تیس میل دور بڑی باقاعدگی سے پیر جی کے استانے پر ڈھوک مراد شاہ جایا کرتے تھے اور جمعہ کی نماز وہیں پیر جی کے استانے پر باجماعت ادا کرتے تھے جب سے وہ پیر جی کے مرید ہوئے تھے وہ اور بھی معتبر ہوگئے تھے اور لوگوں نے ان کے متعلق قیاس آرائیاں کرنا چھوڑ دی تھیں کہ وہ چرس اور افیون کی اسمگلنگ کرتے ہیں بلکہ اکثر لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ حضرت صاحب اپنی گدی انہیں ہی دے جائیں گے۔ یوں گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

☆☆☆

محمد کریم عرف کریما بہت اچھا کک تھا۔ اس لیے وہ صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں کا منظور نظر تھا۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی اچھے کھانے پکاتا تھا لیکن جمعہ کے روز وہ خاص احتیاط سے کھانا تیار کرتا۔ یوں بھی جمعہ کی رات کو کھانے پر خاص اہتمام ہوتا تھا۔ کیونکہ جمعہ کی شام کو صاحب گھر اکیلے نہیں آتے تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک خوبصورت مہمان بھی ہوتا تھا۔ جب سے کریما نے یہاں نوکری کی تھی کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرا تھا جس کی شام صاحب اکیلے واپس آئے ہوں۔ اس

معاملے میں اس کے صاحب بڑے بااصول آدمی تھے۔ جمعہ کے علاوہ عام دنوں میں وہ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ گھر نہیں آئے تھے۔ صاحب ہی نہیں بیگم صاحبہ بھی بڑی بااصول تھیں۔ انہوں نے صاحب کے ان معاملات میں بھی دخل نہیں دیا تھا بلکہ جمعہ کی صبح ہی وہ اپنے الگ بیڈ روم میں منتقل ہو جایا کرتی تھیں اور کریما کو صبح ہی صبح رات کے کھانے پر خاص اہتمام کی ہدایت دیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کریما کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ یہ بیگم صاحبہ آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ جو صاحب ان کی آنکھوں کے سامنے گھر میں نئی نئی لڑکیاں لاتے ہیں تو کچھ نہیں کہتیں اور تب بوا بھی جو اس گھر کی بہت پرانی ملازمہ تھیں، رازدارانہ لہجے میں اسے بتاتیں۔

"شروع شروع میں بیگم صاحبہ بھی بڑا واویلا مچایا کرتی تھیں مگر پھر پتہ نہیں ان کے دل میں کیا آیا کہ انہوں نے خود ہی خاموشی اختیار کرلی۔ آپ ہی سمجھوتا کرلیا۔ شائد اپنی سماجی سلامتی کے لیے۔"

یہ سمجھوتے والی بات کریما کو کچھ زیادہ پسند نہ آتی تھی۔ بھئی بیویاں تو شور مچایا ہی کرتی ہیں اور پھر ایسی باتوں پر تو انہیں واویلا کرنا ہی چاہیے۔ بیویاں شوہروں سے نہیں لڑیں گی تو کیا شہر والے آکر لڑیں گے مگر بیگم صاحبہ لڑنا تو کجا جب تک وہ اجنبی لڑکی صاحب کے ساتھ رہتی ان کے بیڈ روم کی طرف دیکھتی تک نہ تھیں۔

جمعہ کے روز کریما سرِشام ہی مصروف ہو جاتا تھا۔ کبھی شامی کبابوں کے لیے قیمہ تیار کر رہا ہے اور کبھی کڑاہی گوشت پکا رہا ہے اور کبھی مرغ روسٹ کر رہا ہے جوں ہی صاحب کی گاڑی پورچ میں داخل ہوتی وہ سارے کام چھوڑ کر ٹرالی میں سامان سجانے لگتا۔ کاجو، نمکین، پستہ، بادام، دالیں، بسکٹ وغیرہ کی پلیٹیں رکھتے تھے وہ کچن کی کھڑکی سے باہر بھی جھانکتا رہتا صاحب ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنی خوبصورت مہمان کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں چلے جاتے تو وہ جلدی جلدی چائے دم دے کر ٹرالی دھکیلتا ہوا ان کے بیڈ روم میں پہنچ جاتا۔ صاحب اس کی اس مستعدی پر بہت خوش ہوتے تھے اور اکثر انعام واکرام سے بھی نواز دیتے تھے۔

صاحب نے اپنے بیڈ روم میں ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت سا بار بنا رکھا تھا۔ بیڈ روم کی مشرقی دیوار میں خوبصورت سیپیوں کے کام والی منقش الماریاں تھیں اور ان کے اندر درازیں تھیں جن میں ملک ملک کی سینکڑوں اقسام کی شرابیں موجود تھیں۔ صاحب جس قسم کی شراب پینا چاہتے تھے بٹن دباتے اور ان کی مطلوبہ شراب دراز کے ساتھ باہر آجاتی۔ یہ مختلف اقسام کی شرابیں خوبصورت بوتلوں میں بند تھیں۔ ٹیڑھی سیدھی، بل کھاتی، موٹی، خوبصورت نازنین کی شبیہہ میں ادا سے بیٹھی ہوئی، عقاب کی صورت سنہری ڈھکنوں والی، سنہری زنجیروں میں بندھی ہوئی یہ شیشیاں اتنی خوبصورت تھیں کہ ان میں سے کچھ بیگم صاحبہ نے ڈیکوریشن پیسز کے طور پر ڈرائنگ روم میں سجا رکھی

تھیں۔ کارنر کے پاس سے گزرتے ہوئے جہاں یہ بوتلیں سجی تھیں کئی بار کریے کا جی للچایا تھا کہ وہ ان خوبصورت بوتلوں کے اندر موجود مشروب کو چکھ کر دیکھے مگر ان کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی اسے ابکائی آ جاتی اور وہ توبہ استغفار کرتا ہوا باہر آ جاتا۔

صاحب کو چائے بنا کر دیتے ہوئے وہ بڑے دھیان سے ان کی خوبصورت مہمان کو بھی دیکھتا رہتا اور واپس آ کر یہ ضرور کہتا۔

"اپنی بیگم صاحبہ کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں۔ ایکدم بنڈل مال ہے۔"

بوا جی ایک ٹھنڈی آہ بھرتیں۔ انہوں نے کبھی اس پر تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن کریے کو باتیں کرنے کا چسکا تھا۔ کام کرتے ہوئے بھی اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی۔

"دیکھیے بوا جی یہ پیاز ذرا باریک باریک کاٹیے۔ اور ہاں قیمے میں مرچیں زیادہ نہ ہوں۔"

شامی کبابوں کے لیے مسالہ تیار کرتے ہوئے بھی وہ بولتا رہتا۔

"اور پتا ہے بوا جی آج ہمارے صاحب نے ایک غریب لڑکی کی شادی کے لیے دس ہزار روپیہ دیا ہے اور افغان مہاجرین کے لیے پانچ سو کمبل بھجوائے ہیں۔ اپنا صاحب بھی بادشاہ آدمی ہے۔ بس یہ ایک ذرا پینا پلانا اور چھوکریوں سے ملنا چھوڑ دے تو ایک دم گریٹ آدمی ہے۔"

بوا جی ٹھنڈی آہ بھرتیں۔ انہیں بات بات پہ ٹھنڈی آہیں بھرنے کی عادت تھی۔ وہ کہتیں۔

"یہ دنیا بھی اور وہ دنیا بھی دونوں ہی امیروں کے لیے ہیں۔ ہم غریبوں کا تو نہ یہ جہاں نہ وہ جہاں۔"

"وہ کیسے بوا جی؟" کریما پوچھتا۔

"اے لو تجھے نہیں پتا! بوا جی پھر ٹھنڈی آہ بھرتیں۔

"یہ جو امیر آدمی مٹھیاں بھر بھر دولت لٹاتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، غریبوں کو دیتے ہیں اور ہر سال حج کرتے ہیں تو وہ جہان ان کا ہوا یا نہ ہوا۔ پیسہ ہو تو دونوں جہان اپنے بچپن سے سنتے آئے ہیں جس نے تین بار حج کر لیا اس پر جہنم کی آگ حرام ہو گئی۔ پیسہ ہو تو آدمی اپنے صاحب جی کی طرح تین بار چھوڑ دس بار حج کر لے۔ غریب بیچارا اپنے پیٹ کی آگ بجھائے یا راہِ خدا میں خیرات دے۔"

پر بوا جی اپنی مسجد کے مولوی صاحب تو کہتے تھے کہ غریب آدمی اپنے دل میں دس بار خدا کی ثنا کر لے تو اسے امیر آدمی کے دس ہزار روپے خیرات کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور غریب آدمی کا حج تو یہی ہے کہ وہ....."

لیکن بوا جی اس کی بات سنے بغیر اپنی ہی کہے جاتیں۔

"کیسے کیسے ابال اٹھتے ہیں دل میں، کیسا کیسا۔ جی مچلتا ہے کہ درِ حبیب پہ جاؤں، پلکوں سے وہ زمین چوموں اور آنکھوں سے لگاؤں۔ دس سال سے حج کے لیے پیسے جمع کر رہی ہوں، پر ہر سال کچھ نہ کچھ کمی پڑ جاتی ہے۔ اور صاحب ہیں جو مزے سے ہر سال حج کر آتے ہیں۔"

☆☆☆

کریما کڑاہی گوشت میں چمچ ہلاتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں گنگنانے لگتا۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے
جسے چاہا در پہ بلالیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا

اندر صاحب کے بیڈ روم سے ملے جلے قہقہوں اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں آتی رہتیں۔ وقفے وقفے سے گلاسوں کی کھنکھناہٹ گونجتی رہتی اور کریما کام کرتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں عجب سوز سے گنگناتا رہتا۔

جسے چاہا در پہ بلالیا جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

نعت کے بولوں کے ساتھ ساتھ بوا جی کا دل گداز ہو کر پگھلتا رہتا اور وہ پیاز کاٹتے ہوئے سوچتی رہتیں کہ یہ جب میاں جی گاڑی سے اترے تھے تو ان کی پیشانی کیسے جگمگا رہی تھی اور پیر جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے چہرے پر کیسا نور اتر آیا تھا۔

دس کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی کی عقبی سمت بنے ہوئے سرونٹ کوارٹروں کے ایک کمرے میں بارہ سالہ ناصر اپنی وہیل چیئر کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے بڑی بے چینی سے ماسٹر اللہ بخش کا انتظار کیا کرتا ایک بجتے ہی اس کی نگاہیں دروازے کی طرف لگ جاتیں تھیں کیونکہ ایک بجے سکول بند ہوتا تھا اور ماسٹر اللہ بخش اسکول سے چھٹی کر کے سیدھے اسی کی طرف آتے تھے۔ ناصر کے لیے ماسٹر اللہ بخش کا وجود ایک ایسے روزن کی مانند تھا جس سے باہر کی ہوا اور روشنی اس کی زندگی میں آتی تھی اگر وہ نہ ہوتے تو اس کا دم گھٹ جاتا۔ ان کے بغیر ناصر کی زندگی ایک ایسے بند کمرے کی سی تھی جس میں نہ دروازے تھے، نہ کھڑکیاں اور نہ روشندان۔ ماسٹر اللہ بخش اس کے لیے دروازے، کھڑکیاں اور روشندان تھے۔ اگر ان کے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ نہ جانے کتنی بار مضطرب ہو کر کھڑکی تک جاتا پھر لوٹ کر کام کرتی آمنہ بی بی سے پوچھتا۔

"ماسٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ اماں کیا وہ آج نہیں آئیں گے؟"

"آئیں گے بیٹا ضرور آئیں گے۔ اسکول میں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔"

"لیکن اگر وہ نہ آئے تو.....؟" وہ بے چین سا ہو کر پوچھتا۔

آمنہ بی بی ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھتی اور پھر نگاہ جھکا لیتی۔

"تو ان کی مرضی بیٹا۔ ان کا یہی کرم کیا کم ہے کہ وہ تمہیں پڑھانے آجاتے ہیں بغیر کسی لالچ کے۔"

لیکن خواہ کتنی بھی دیر کیوں نہ ہو جاتی۔ ماسٹر اللہ بخش ضرور آتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔ انہیں اس بچے سے ہمدردی تھی جسے پولیو نے معذور کر دیا تھا۔ وہ اسے پڑھاتے۔ اس کے لیے لائبریری سے کتابیں لاتے اور اسکول میں آنے والا اخبار بھی وہ اس کے لیے لائبریرین سے مانگ لاتے تھے اور دوسری صبح اسکول جاتے ہوئے وہ اخبار واپس لے جاتے تھے۔ ان کا گھر نزدیک ہی تھا۔ ناصر کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا اور ماسٹر اللہ بخش کے بعد یہ اخبار ہی باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ ماسٹر اللہ بخش اسے پڑھاتے، اس سے باتیں کرتے اور وہ اپنی عمر سے کئی گنا بڑے بچوں کی طرح ان سے ملکی مسائل اور سیاست پر بحث کرتا۔ فالتو وقت میں کاغذ پر پنسل سے جو اسکیچ بناتا رہتا وہ انہیں دکھاتا اور اس پر ان کی رائے لیتا۔ اس کا ہاتھ بے حد صاف تھا لکیریں، زاویے اور قوسیں الجھی ہوئی نہیں بلکہ صاف اور واضح تھیں۔ اس نے مشہور لیڈروں کے جو اسکیچ بنا رکھے تھے ان میں بھی ان کے فیگر بہت صاف اور واضح تھے۔

ماسٹر اللہ بخش اس کا کام دیکھ کر بڑے دکھ سے سوچتے اگر وہ کسی اچھے آرٹ اسکول میں پڑھتا تو یقیناً ایک دن نام پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں کے وسط میں پھیلی ہوئی باریک، گہری، نفیس، روشن دماغی لکیر جس کے اختتام پر تین شاخیں نکل رہی تھیں، اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ یہ لڑکا بیک وقت کئی شعبوں میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کے مڈل کے داخلے کے لیے فارم بھر کر بھیج دیں اور جب وہ کامیاب ہو جائے تو اسے میٹرک کی تیاری کروا دیں۔ کیونکہ ان کا اپنا خاندان نو افراد پر مشتمل تھا اور وہ صرف گریڈ ۱۴ کے ملازم تھے۔

ماسٹر اللہ بخش اسے پڑھا کر چلے جاتے تو وہ اخبار میں کھو جاتا لیکن ساتھ ساتھ آمنہ بی بی سے باتیں بھی کرتا جاتا۔

"میں باہر جانا چاہتا ہوں اماں، کسی دوسرے شہر میں۔ جہاں کوئی آرٹ اسکول ہو۔ لاہور یا کراچی۔ میں باہر جا کر پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن بیٹا یہ ماسٹر صاحب جو تمہیں پڑھاتے ہیں۔"

"جو کچھ ماسٹر صاحب مجھے پڑھاتے ہیں وہ سب تو میں جان چکا ہوں۔ میں کچھ اور جاننا

چاہتا ہوں ماں وہ جو ماسٹر صاحب نہیں جانتے۔ میں مصور بننا چاہتا ہوں ماں۔ دیکھنا ایک دن میں ملک کا سب سے بڑا مصور بنوں گا۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں میرے ہاتھ بالکل فنکاروں جیسے ہیں۔"

وہ اپنی لانبی لانبی نازک انگلیوں والے نرم گلابی ہاتھ کو دیکھتا۔ "ماں مجھے کچھ رنگ، برش، کینوس اور ایک ایزل لا دو۔"

اور ماں ہر بار سوچتی کہ اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کرے گی مگر وہ جتنا کماتی تھی سارا اس کی دواؤں اور کھانے پینے کی چیزوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔ اس سے سلائی کرانے والے نچلے طبقے کے غریب لوگ تھے جو دو دو چار چار روپے کر کے اسے اجرت دیتے تھے ماں کو خاموش دیکھ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگتا اور اخبار دیکھتے دیکھتے ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ اپنی وہیل چیئر کو ماں کے قریب لے آتا۔

"ماں یہ دیکھو۔" وہ اخبار اس کے سامنے پھیلا دیتا "یہ رہی خان انکل کی تصویر..... انہوں نے آج فلاں ادارے کو اتنا چندہ دیا ہے۔" وہ ملتجی نظروں سے ماں کی طرف دیکھتا۔ "ماں تم بھی کبھی جاؤ نا خان انکل کی طرف انہیں بتاؤ کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں باہر جا کر۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں ضرور اتنی رقم دے دیں گے کہ میں کسی اچھے آرٹ اسکول میں داخل ہو سکوں اور ابھی پرسوں ہی تو انہوں نے اندھے اور گونگے بچوں کے اسکول کے لیے پانچ ہزار روپے دیئے ہیں اور پھر میں ان کا اپنا ہوں ان کا سگا بھتیجا۔"

اور آمنہ بی بی سوچتی۔ اگر انہیں اتنا ہی اپنے سگے بھتیجے کا خیال ہوتا تو بھائی کے مرنے کے بعد وہ اسے اپنی وسیع کوٹھی کا ایک کمرہ نہ دے دیتے۔ اس کا ماہانہ نہ مقرر کر دیتے..... لیکن وہ ناصر سے کچھ نہ کہتی۔

"ہاں بیٹے کسی دن جاؤں گی لیکن ماسٹر صاحب کہتے ہیں پہلے تم میٹرک کر لو پھر تمہیں کسی اچھے سے آرٹ اسکول میں داخل کرا دیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔"

اور ناصر اپنی چیئر کو کھڑکی تک لے جاتا اس کھڑکی سے کوٹھی کا عقبی گیٹ نظر آتا تھا اور خان انکل جب کبھی دوپہر کو فیکٹری سے کھانے کے لیے گھر آتے تھے۔ تو گاڑی کو عقبی سمت میں کھڑی کرتے تھے اور ناصر کھڑکی پر جھکا بڑے احترام، عقیدت اور محبت کے ملے جلے جذبات سے انہیں دیکھتا رہتا کیونکہ اس کے سارے خواب اور ساری امیدیں وہی پوری کر سکتے تھے۔

ناصر نے کئی دنوں بعد آج اخبار دیکھا تھا۔ آج صبح سے اس کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ ورنہ پچھلے کئی دنوں سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں شدید تکلیف تھی جس سے بخار بھی ہو گیا تھا اور سانس بھی بار بار سینے میں اٹک جاتا تھا۔ ماں کئی دنوں سے اس کی پٹی سے لگی ہوئی تھی۔ ماسٹر اللہ

بخش بھی دن میں دو بار اسے دیکھنے آتے تھے۔ آمنہ بی بی نے بچت کر کے جو تھوڑی بہت رقم اکٹھی کی تھی وہ سب ڈاکٹر کی فیسوں اور دوائیوں میں اٹھ گئی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ناصر کے پاس ہونے کی خوشی میں وہ ماسٹر صاحب کو کیٹی کا سوٹ دے گی۔ آخر وہ اسے بغیر کسی لالچ کے پڑھاتے تھے لیکن ناصر کی اچانک بیماری میں سب کچھ خرچ ہو گیا تھا۔ ناصر نے بستر پر لیٹے لیٹے اخبار آمنہ بی بی کی طرف بڑھایا۔

"ماں یہ دیکھو۔ خان انکل نے غریب بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دینے کا اعلان کیا ہے۔ میں بھی ماسٹر جی سے ایک درخواست لکھوا کر خان انکل کی طرف بھجوا دوں گا تم تو ان کے پاس جاتی نہیں ہو۔"

"جاؤں گی بیٹا جاؤں گی۔"

"مجھے پتہ ہے تم کبھی نہیں جاؤ گی۔" ناصر نے شکوہ کیا تو آمنہ بی بی نے منہ موڑ کر اپنے آنسو چھپا لیے۔ وہ اسے نہ بتا سکی کہ ابھی کل ہی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس کی اچانک خان انکل سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور اس نے انہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ ناصر بہت بیمار ہے لیکن انہوں نے ذرا دھیان نہ دیا تھا۔

ناصر یونہی لیٹے لیٹے پرانے اخبار دیکھتا رہا اور آمنہ بی بی مشین لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن شام ہوتے ہوتے ناصر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے سینے میں ناقابل برداشت درد تھا اور بخار بھی تیز ہو گیا تھا۔ آمنہ بی بی ماسٹر اللہ بخش کو ناصر کے پاس بٹھا کر بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس گئی..... ڈاکٹر نے اسے آ کر دیکھا۔

"میرا خیال ہے اس کے دل کے والیوم صحیح طرح سے کام نہیں کر رہے جبھی سانس ٹھیک نہیں ہو رہا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے لاہور لے جائیں۔ یہاں اس چھوٹے سے شہر میں علاج یک ساری سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ وہاں ڈاکٹر نور ہیں ہارٹ اسپیشلسٹ۔ ان کے نام میں خط لکھ دیتا ہوں۔ صحیح تو وہی بتا سکیں گے کہ کیا تکلیف ہے۔"

لیکن آمنہ بی بی تو بالکل تہی دامن تھی۔ اس نے بے بسی سے ماسٹر اللہ بخش کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بہن حوصلہ رکھیں..... آپ خان صاحب سے مدد کیوں نہیں مانگتیں۔ آخر ناصر ان کا اپنا ہے۔"

"ہاں۔" آمنہ بی بی نے ناصر کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے پڑا تھا جس کی سانس کی آواز بڑی عجیب و غریب سی ہو رہی تھی۔ اس کے حلق سے یوں خرخر کی آواز آ رہی تھی جیسے کسی

جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ بیٹھیں ماسٹر جی، میں ذرا خان صاحب کے ہاں جا رہی ہوں۔" وہ بڑی بیقراری سے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکلی لیکن لوہے کے بڑے سے گیٹ کے پاس جہاں میاں۔ ایم۔ این خان کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی، وہ ٹھٹھک کر جھجک کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ بچوں کا عالمی سال تھا اور پورے جوش و خروش سے منایا جا رہا تھا۔ سال تو اسی طرح منائے جاتے ہیں عورتوں کا سال، بچوں کا سال، معذوروں کا سال، بڑے بڑے پلان اور منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ فنکشن ہوتے ہیں۔ پارٹیاں ارینج کی جاتی ہیں..... اور پھر سال گزر جاتا ہے۔ نیا سال آ جاتا ہے اور نئے سرے سے، نئے منصوبے، نئے پلان بنائے جاتے ہیں..... اور بڑے بڑے عہد کیے جاتے ہیں..... سو یہ بچوں کا سال تھا اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے بڑے بڑے پلان اور منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ مختلف ادارے بچوں کے لیے خصوصی پروگرام اور دھڑا دھڑ فنکشن کر رہے تھے۔ اور ان فنکشنز کی آڑ میں مفت کی پبلسٹی ہو رہی تھی۔ مشہور سماجی کارکن میاں ایم۔ این خان نے بھی بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ادارے کے قیام کا اعلان کیا تھا جس میں بچوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کے علاوہ ذہین بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیے جانے تھے۔ تاکہ مالی مجبوریوں کی وجہ سے ذہین بچوں کی صلاحیتیں ضائع نہ ہوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اخباری رپورٹرز کو بڑا جذباتی بیان بھی دیا تھا جو بڑی بڑی سرخیوں اور ان کی تصویر کے ساتھ اخبار میں چھپا تھا۔ انہوں نے اس ادارے کا عارضی دفتر اپنی دس کنال پر پھیلی ہوئی وسیع کوٹھی میں مہمانوں کے لیے بنائی گئی انیکسی میں قائم کیا تھا اور ادارے کے افتتاح کے سلسلے میں ایک تقریب بھی منعقد کر ڈالی تھی۔ کوٹھی کو رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ لان میں ایک اسٹیج بھی بنایا گیا تھا کیونکہ سامعین کی دلچسپی کے لیے ایک ورائٹی پروگرام بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ ٹی وی اور اسٹیج آرٹسٹ بلائے گئے تھے۔ معززین شہر کے علاوہ اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی موجود تھے۔ بچے، رنگ برنگے کپڑے پہنے تتلیوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میاں صاحب نے اس افتتاحی پروگرام پر چار ذہین طلباء کو وظائف دینے کا اعلان بھی کرنا تھا۔

سفید وردیوں میں ملبوس بیرے ٹرے میں مختلف مشروب سجائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ پروگرام شروع ہوا تو سب سے پہلے دو کامیڈین مائیک ہاتھ میں لیے اسٹیج پر آئے اور اپنی دلچسپ باتوں سے سامعین کو ہنسانے لگے۔ لوگ دل کھول کر ہنس رہے تھے..... اور گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے عورت کے خوبصورت سنگی مجسمے کے پیچھے کھڑی آمنہ بی بی یہ ساری کارروائی دھندلی دھندلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے میاں

صاحب کو ناصر کی کیفیت بتا کر مدد طلب کی تھی تو انہوں نے اسے کتنی بری طرح دھتکار دیا تھا۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو بی بی کہ میری دولت پر تمہارا بھی کوئی حق ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ یہ ساری دولت میں نے اپنے قوت بازو سے حاصل کی ہے۔ ورثے میں تو مجھے قرضوں کے بوجھ سے لدی ہوئی ماچس فیکٹری ملی تھی اور تمہارا خاوند ان قرضوں کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں میاں صاحب لیکن ناصر بہت بیمار ہے اور ڈاکٹر نے....."

"میں نے سارے شہر کے یتیموں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے جیسے میں نے روپے بنانے کی مشین لگا رکھی ہو۔"

وہ غصے میں دندناتے ہوئے اندر چلے گئے تھے اور وہ وہیں سنگی مجسمے پر ہاتھ دھرے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی..... اس خوش فہمی میں کہ شاید میاں صاحب پھر ادھر سے گزریں تو اس کی بات سن لیں۔ اندر جانے کی تو اس میں ہمت نہ تھی لیکن آج وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح بنجر زمین میں امیدوں کے بیج ڈالے بیٹھی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس سے ضرور کونپل پھوٹے گی اور اس میں پھول لگیں گے۔ کیا پتہ میاں صاحب کا دل پگھل جائے، موم ہو جائے۔ یہ جو اخبار والے آئے دن ان کے متعلق لکھتے رہتے ہیں تو جھوٹ تھوڑا ہی لکھتے ہوں گے۔ یہ تو میں نے خود ہی فضول کی خودداری میں اپنا دامن کھینچ لیا تھا ورنہ کیا پتہ میاں جی..... انہیں ناصر کے ابا پر غصہ بھی تو ہے نا۔ وہ لاکھوں روپے کا قرض دیکھ کر ڈر گئے تھے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پروفیسری کرنے لگے تھے۔ اگر وہ میاں صاحب کے ساتھ ہی رہتے تو آج ناصر کا حصہ بھی ہوتا فیکٹری میں....." وہ میاں جی کا انتظار کرنے لگی..... ہنسانے والے فنکار جانے کب کے اسٹیج سے جا چکے تھے۔ اور اب دو بچیاں آ کر گیت گا رہی تھیں۔

ناصر نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا ماسٹر صاحب، نہ ماں جی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ماسٹر صاحب یہیں تھے..... انہوں نے اسے بتایا کہ ماں میاں صاحب کے گھر گئی ہے اور شاید انہوں نے پوچھا تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک ہو تو وہ چلے جائیں؟ اور اس نے انہیں اجازت دے دی تھی..... ماں نے پتا نہیں میاں صاحب سے کیا کہا ہوگا۔ ماں کو چاہیے تھا میری بنی ہوئی کچھ تصاویر بھی اپنے ساتھ لے جاتی..... خان انکل بہت خوش ہوتے۔" میں نے سوچا اور کہنیوں پر زور ڈال کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوٹھی سے آنے والی مدھم مدھم آوازوں کا شور اس کے کانوں میں آیا۔ وہ چونک پڑا۔

"ارے آج تو خان انکل کے ہاں بڑا زبردست فنکشن ہے۔ ماسٹر صاحب نے اسے بتایا تو تھا۔ اگر ماسٹر صاحب ہوتے تو وہ ان سے کہتا ذرا دیر کے لیے اسے بھی ساتھ لے جائیں۔"

کھڑکی اس کے بستر کے قریب ہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ آج عقبی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ انیکسی عقبی سمت تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اور ناصر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ننھی بچیاں آواز ملائے گیت گا رہی تھیں۔

In the name of God

In the name of human being save our soul.

سانس اس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ اس نے بے چینی سے اپنے سینے کو مسلا لیکن سینے میں کہیں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ وہ کھڑکی پر اوندھا ہو گیا۔ سانس اب بھی اس کے سینے میں الجھ رہا تھا۔ اٹک رہا تھا اندر بچیاں گا رہی تھیں۔

In the name of truth.

In the name of love.

میاں صاحب کسی کام سے اٹھے تو آمنہ بی بی نے مجسمے کی آڑ سے نکل کر بے چینی سے انہیں بلایا۔

"میاں جی۔"

"تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟" وہ جھنجلائے اور اپنے پیچھے آتے کریے سے کہا۔ "اس خاتون کو باہر نکال کر گیٹ بند کر دو۔"

امیدوں کے سارے پھول جو آمنہ بی بی بنجر زمین میں اگانے کی کوشش کر رہی تھی..... مر گئے..... وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مڑی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی بے چین نظروں نے ناصر کو کھڑکی کی دہلیز پر اوندھا پڑے دیکھا۔ بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے لپک کر اس نے اسے سیدھا کیا۔ اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

"ناصر، ناصر۔" ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہیں ناصر نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔ اور اس کا آخری سانس اندر ہی کہیں الجھ کر ٹوٹ گیا..... ناصر جس کی گلابی پوروں والی نرم ہتھیلی کے وسط میں لمبی سی سہ شاخہ بے حد گہری۔ باریک روشن دماغی لکیر تھی..... اور اسٹیج پر مائیک ہاتھ میں لیے بے پناہ تالیوں کی گونج میاں ایم۔ ان۔ خان چار ذہین طلباء کو وظائف دینے کا اعلان کر رہے تھے۔ فضائیں ابھی تک گیت کے بولوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

In the name of love

In the name of God.

Save our soul. Save our soul.

اور آمنہ بی بی ناصر کی بند آنکھوں، بند ہونٹوں اور سرد چہرے کو بے تحاشا چوم رہی تھی۔